

قال اللہ وقال الرسول ہی نہیں اس کی بھی ایک متعین صورت یعنی مسلک حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن و سنت کا معروضی (OBJECTIVE) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامرو نواہی کے اسرار و حکم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑا علمی مشغلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری و ماتریدی عقائد اور فقہ حنفی کے لئے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کئے جائیں..... دوسری طرف جدید علوم و فنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبیعیات، کیمیا، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ پچھلی دو تین صدیوں میں فراہم کیا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ و منطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلا واسطہ علم انہیں حاصل نہیں..... گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی و فکری اعتبار سے خالصتاً آج سے سات آٹھ سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں کچھ حضرات اپنی تحریر و تقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسد ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحر محیط میں دو روئیں بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیحدہ علیحدہ بعینہہ اسی کیفیت کے ساتھ چلی جا رہی ہیں جس کا نقشہ سورہ رحمن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ!

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ
بِئْسَ لِلتَّائِبِينَ يُبْعَثَانِ
چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے
(بھی) ہیں (اور) ان کے مابین ایک
حجاب (بھی) ہے (جس سے) تجاوز
نہیں کر سکتے۔

ان دو متضاد فکری و تمدنی سورتوں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیوبند کا اور پوری ملت دو نمایاں طور پر

مختلف مکاتب فکر و نقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک معر اور مایوس کن..... ایک جانب جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی ہے لیکن طحانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان و اسلام ہے لیکن جمود و مطلق اور فرسودہ و از کار رفتہ فلسفہ و منطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتب فکر کو علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے..... اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تاحال ان کے مابین امتزاج کی کوئی موثر صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر و بیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرجدار تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملت اسلامی کی اس وقت کی سب سے بڑی بد قسمتی یہی ہے کہ اس ”آویزش“ میں کسی واقعی و حقیقی ”آمیزش“ کا رنگ تاحال پیدا نہیں کیا جا سکا۔



حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف وحدت اُمت ہیں اگر

○ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمود حسن اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ دیکھتے تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تِلّے کی مستحق ہوتی وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو اب محتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایان شان طور پر شائع کیا ہے۔
بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیر کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدایہ : ۳ روپے ○ علاوہ مضموندار کا

علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں

یوں تو ایک عظیم ملت میں فکر و نظر کے صد ہارنگوں (SHADES) کا پایا جاتا ایک فطری اور قدرتی امر ہے، چنانچہ ہماری قوم میں بھی سوچنے کے لاتعداد انداز اور غور و فکر کے بے شمار طور طریقے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ذرا دقت نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فکر و نظر کے ان لاتعداد رنگوں میں اصل اور پختہ رنگ دو ہی ہیں۔ ایک علی گڑھ کا دوسرا دیوبند کا۔ بقیہ تمام رنگ جو ان کے مابین یا ان کے ارد گرد پائے جاتے ہیں سب ان کے امتزاج ہی سے وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے کسی میں علی گڑھ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور کسی میں دیوبند کا..... گویا کہ ہماری ملت کے بحر محیط کی اصل دو روئیں یہی ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے مَرَجُ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيْنَ ○ کی طرح بالکل ملحق اور متصل لیکن بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيْنَ ○ کی سی علیحدگی اور لا تعلقی کے ساتھ مسلسل چلی آ رہی ہیں..... ان میں سے ہر ایک کا ایک مستقل ماضی اور متعین فکری اساس ہے، اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک وسیع و عریض اور پختہ محکم نظام تعلیم بھی موجود ہے، لہذا ان دونوں کے اثرات نہایت دور رس ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے جسد ملی میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ گویا کہ یہ دونوں مکاتب فکر ہماری قومی و ملی زندگی میں ”أَصْلُهَا ثَابِتٌ“ کی سی محکم اساس اور ”وَفَرَّ عَنْهَا فِي السَّمَاءِ ○“ کا ساہمہ گیر اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

۱۔ کیا اللہ کی شان ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان کے ان دونوں دینی و مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی سوتوں کے اصل منبع ہندوستان ہی میں رہ گئے..... اور یہی نہیں بلکہ جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا، ان دونوں کے مابین امتزاج کی جتنی کوششیں ہوئیں ان سب کے اصل مراکز

ان میں سے علی گڑھ کی ”مذہبی عقلیت“ جسے جسٹس امیر علی، سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی وغیرہم نے مرتب کیا تھا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں، ساتھ ہی اس کے مقابلے میں دیوبند جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں پڑی اور جن کے ذریعے اس میں کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ حاجی امداد اللہ مہاجر کی کی روحانیت بھی سرایت کر گئی تھی، جس طرح قال اللہ اور قال الرسول کا حصار اور دین و مذہب کے ”نقل“ کے دفاع کا مرکز بنا، اس کی تفصیل بھی ہم بیان کر چکے ہیں..... اور دونوں کے ”مذہبی فکر“ کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے..... لیکن اس کے بارے میں گمان درست نہ ہو گا کہ یہ بُعد ہمیشہ ہر حال اور ہر صورت میں موجود رہا۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھریں جو اپنے اصل مکتب فکر کے مجموعی مزاج کی بالکل ضد ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ”حسن از بصرہ، بلال از حبش، صہیب من از روم“ کے مصداق سرزمین علی گڑھ سے بھی بہت سے راسخ العقیدہ، درد مند، ذہنا مسلم اور قلباً مومن لوگ اٹھے جن میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کی مثال ہی اتنی درخشاں و تابناک ہے کہ مزید کی کوئی حاجت نہیں۔ ۱۔ دوسری طرف خاک دیوبند سے مولانا عبید اللہ سندھی ایسی مستجد دانہ مزاج رکھنے والی شخصیت بھی ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں بھرپور مشاہدہ بھی کیا۔ اور جدید رجحانات کے زیر اثر ملت اسلامیہ کے لئے تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے استناد دیوبند کے موجود الوقت مقلدانہ حوالے سے نہیں بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ ارتقا قات ہی سے مل سکتا تھا!..... تاہم یہ مثالیں محض استثنائی ہیں اور ایک انگریزی ۲۔ مثل کے مطابق، ان سے وہ کلیہ مزید مستحکم ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا تھا۔ یعنی یہ کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کم از کم بُعد المشرقین موجود ہے ۳۔

۴۔ خود علامہ اقبالؒ جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے آئے گا ہر حال اسی شاخ سے متعلق ہیں۔

EXCEPTIONS PROVE THE RULE ! ۵۔

۶۔ یہ بُعد صرف مذہبی تصورات اور دینی فکر کے میدان تک ہی محدود نہ رہا بلکہ جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، اس بُعد سے ملی و قومی سیاست بھی بری طرح متاثر ہوئی اور اس میدان میں بھی ان دونوں کے رخ بالکل متضاد سمتوں میں مڑ گئے۔

اس بُعد کا احساس بھی بالکل شروع ہی سے ہو گیا تھا اور اس فاصلے کو کم کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی ضرورت بھی بالکل ابتداء ہی سے محسوس کی جانے لگی تھی..... چنانچہ ان کے مابین امتزاج اور ارتباط کی کوششوں کا سراغ بھی بالکل ابتداء ہی سے ملتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام ان کوششوں کا مظہر اول تھا..... اور دہلی میں جمعیت الانصار اور جامعہ ملیہ کا قیام مظہر ثانی پھر ان ہی کوششوں کا ایک تیسرا مرکز جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بنا اور اس نے بھی جدید و قدیم کو قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

ندوہ کے بزرگیں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ علی گڑھ کی کوکھ سے برآمد ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم جو پہلے علی گڑھ کے پروفیسر شبلی تھے اور بعد میں ندوہ کے علامہ شبلی بنے، ابتداءً سرسید مرحوم کے رفقاء اور اعموان و انصار میں سے تھے۔ جو بعد میں ان سے بدظن اور ان کی تعلیمی سکیم سے غیر مطمئن ہو کر ان سے علیحدہ ہوئے۔ ہمیں یہاں ان اسباب سے کوئی بحث نہیں جن کی بنا پر یہ علیحدگی واقع ہوئی۔ ہمیں بحث قیام ندوہ کے صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ قدیم و جدید..... اور تجدید و جمود کے مابین ایک متوازن علمی و فکری راہ پیدا کرنے کی سعی کا سب سے پہلا اور ہر اعتبار سے اہم ترین مظہر ہے۔

لیکن..... یہ ایک واقعہ ہے کہ ندوہ فکر و نظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گہوارہ اور تاریخ اسلامی کا ایک دارالاشاعت بن کر رہ گیا۔ اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا.....!

ایک جدید لیکن متوازن ”علم کلام“ کی تدوین کی ضرورت کا احساس تو مولانا شبلی کو شدت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی لئے پہلے انہوں نے ”علم الکلام“ میں قدیم علم کلام کی تاریخ مرتب کی اور پھر نیا علم کلام ”الکلام“ کے نام سے لکھنا شروع کیا..... لیکن ایک تو وہ اس کی صرف ایک جلد لکھ کر رہ گئے حالانکہ اس کی تکمیل ان کے پیش نظر سکیم کے مطابق تین جلدوں میں ہونی تھی۔ اور دوسرے یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

..... غالباً اس لئے کہ اس پہلی ہی جلد پر جو مخالفت ہوئی اور کفر کے فتوے موصول ہوئے۔

کہ وہ وقت کے تقاضے کو بھی بالکل نہ سمجھ پائے۔ اور جو ”علم کلام“ اس وقت حقیقتاً مطلوب تھا اس کے فروغ کے اصول بھی ان پر واضح نہ ہو سکے!

جن دو انتہاؤں کے مابین مولانا شبلی ایک متوازن راہ نکالنا چاہتے تھے ان کا تذکرہ خود ان کے الفاظ میں سنئے۔

”حال ہی میں علم کلام کے متعلق مصر، شام، ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور نئے نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل و دلائل ہیں جو متاثرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے ۱۔ یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معقولات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ کر ان سے ملادیا ہے ۲۔..... پہلا کورانہ تقلید ہے اور دوسرا تقلیدی اجتہاد ۳۔“ (علم الکلام - تمہید)

ان دونوں کو رد کر کے جس تیسرے علم کلام کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں جب بد تعلیم یافتہ گروہ ”کافظہ نظر مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

”ہر طرف سے صدائیں آ رہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہو گا۔ کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے، آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محسن قیاسات اور منظونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیانتا اور تجربہ کا سامنا ہے اس لئے اس کے مقابلے میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفستہ بیانیوں سے کام نہیں چل سکتا“ (ایضاً)

لیکن کمال سادگی کے ساتھ اس رائے کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ۔

”لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا۔ اور جو حصہ اس وقت کار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ کسی شے کی صحت

۱۔ یہ صاف اشارہ ہے حلقہ دیوبند کی نئی کلامی تصنیفات کی جانب جیسے مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ”حجتہ الاسلام“!

۲۔ مراد ہے سر سید احمد خان اور مولوی چراغ علی کا علم کلام

۳۔ مولانا کا یہ طرز تعبیر یقیناً بہت قابل داد ہے۔

اور واقعیت زمانہ کی امتداد و انقلاب سے نہیں بدلتی۔ اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ ہے کہ علم کلام کو قدیم اصول اور موجود مذاق کے موافق مرتب کیا جائے۔۔۔۔۔ (ایضاً)

چنانچہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یہی تھا کہ قدیم علم کلام کو نئے اسلوب، نئے پیرایہ بیان اور نئے انداز میں گویا کہ نئے ”مذاق“ کے مطابق پیش کر دیا۔

لیکن اصل مسئلے کے فہم کی کوتاہی میں مولانا شبلی غالباً بالکل معذور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے زمانے تک جدید فلسفے اور سائنس کا ادغام نہیں ہوا تھا۔ دوسرے خود فلسفہ بھی ابھی صرف پنسر اور مل تک ہی پہنچا تھا۔ گویا کہ فکر جدید کا اصل چیلنج ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ”الکلام“ کے مقدمے میں مولانا نے فلسفہ و سائنس کی موجودہ اوقات صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”تمام دنیا میں ایک غل بچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور فلسفہ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ فلسفہ و مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدا میں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفہ قدیمہ قیاسات اور ظنّیات پر مبنی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے مذہب کسی طرح اس کے مقابلے میں جانبر نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الہیات، مابعد الطبعیات سب شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے جو مسائل مشاہدہ تجربہ کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا!“

لیکن افسوس کہ یورپ میں یہ ”نہایت صحیح اصول“ بس تھوڑی دیر ہی چل سکا اور جلد ہی اس کے بجائے وہ ”فطری اصول“ پھر بروئے کار آ گیا کہ علم ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور اسے سائنس اور فلسفے کے دو جدا گانہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ یورپ کا بعد

لہ بقل اکبرالہ آبادی مرحوم۔
عسکری درومی کی بھلا کون نے گا!
محفل میں چھڑا نغمہ اپنرو مل ہے!

کافلسفہ ان نظریات کی اساسات پر مرتب و مدون ہوا جو سائنس کے بعض شعبوں سے ابھرے جیسے مثلاً ذراتوں کا نظریہ ارتقاء اور فرائڈ کا نظریہ جنس وغیرہ۔

الغرض جدید دنیا کو جو نیا علم کلام فی الواقع مطلوب تھا۔ اس کے توافیق و اصول و اساسات کے بارے میں بھی مولانا شبلی صحیح تصور قائم نہ کر پائے تو اس کی تدوین کیا کرتے۔ رہا دوسرے معاملات میں علی گڑھ اور دیوبند کے مابین امتزاج تو اس کی بھی کوئی صورت ندوہ میں پیدا نہ ہو سکی۔ اور مولانا شبلی کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جب حلقہ دیوبند کی ایک علمی و روحانی شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو یہ بات بالکل ہی کھل گئی کہ ندوہ کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی حیثیت بس ایک چھوٹی سی لہر کی ہے جو علی گڑھ کی عظیم رو سے نکل کر بالاخر دیوبند کی دوسری بڑی رو میں جا شامل ہوئی۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید سید ابوالحسن علی ندوی نے کچھ عرصہ ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر اسی حلقہ دیوبند کی ایک دوسری روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہ اسی سنت سلیمانی کا اتباع ہے۔ بہر حال اب ندوہ کی حیثیت دیوبند کے ایک ضمیمے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک توسیع (EXTENSION) کی اس کا مستقل جدا گانہ وجود کوئی نہیں!

اس طرح ندوہ تو بہت جلد ختم ہو گیا اور مولانا شبلی جو درمیانی راہ نکالنا چاہتے تھے وہ اس کے ذریعے سے نہ نکل سکی۔ تاہم ان کی یہ خواہش بعض دوسری پگڈنڈیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی و رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا لیکن ان کے زیر اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض دوسری صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہ راست

ندوی تو نہیں ہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے..... اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں مثلاً ایک ہی کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلی کے بالکل برعکس..... جنہوں نے اپنی ’حنفیّت‘ کی شدت کے اظہار کے لئے ’نعمانی‘ کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جز بنالیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی..... لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہی بالکل زاہد خشک تھے، مولانا آزاد کی وضع داری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا، مولانا آزاد، ابوالکلام تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا لگنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہوا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور ادبیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا..... چنانچہ مولانا آزاد طوطی ہند تو تھے ہی ایک وقت ایسا بھی گزر ا جب وہ امام الہندؒ قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ آج تک بھی صرف کچھ علم و دست لوگ ہی واقف ہو سکے..... لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قدیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی۔ جبکہ مولانا فراہی ایک

مستقل طرز فکر اور مکتب علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ ”دائرہ حمیدیہ“ کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بناء پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورہ کف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں، بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا۔ اور ایک طرف نظم قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سر نو مرتب و مدون کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تاحال مسودات ہی کی صورت میں ہیں) خالصۃً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی..... جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آسمان شبلی کے ان ”دلوٹے ہوئے تاروں“ سے برصغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو سوتے پھوٹے ہیں جن کا تذکرہ صورتِ حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔



مولانا فراہیؒ..... کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار، مدرستہ الاصلاح اعظم گڑھ کو سنبھالا دوسری طرف دائرہ حمیدیہ قائم کیا تیسری طرف ۱۳۸۷ء میں ماہنامہ الاصلاح جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ و قس علیٰ ہذا..... لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت میں تھے کہ حکیم فراہیؒ کا یہ جانشین ابوالکلام کے معنوی خلیفہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ”دعوت اسلامی“ کی گھن گرج سے متاثر ہو کر رخت سفر باندھ ان کی خدمت

سعادت بخشی، تو اس کے فضل و کرم سے ”میثاق“ بھی از سر نو جاری ہوا۔ اور بحمد اللہ تاحال جاری ہے ”تدبر قرآن“ کی جلد اول بھی شائع ہوئی اور مولانا کے درس قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے۔

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہ راست تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمر جو راز اور صحت و فراغت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے استاد مولانا فراہی کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسلی کو منتقل کر سکیں ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں اور راقم کو بھی اس نیک کام میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین۔

بہر حال فکرِ فراہی اور سلسلہ تدبر قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کیت اور حلقہ اثر سے تو فی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی خالصتاً قرآن حکیم پر ہے اور اُس میں سارا استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے اور تدبر قرآن کا جو خاص اسلوب و نچ اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاء اللہ حکمت قرآنی کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکر انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی..... مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف، حقیقت شرک، حقیقت توحید، اور حقیقت تقویٰ میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاح معروف تو ہے علم کلام، نہیں لیکن خالص قرآنی علم کلام ضرور ہے اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصتہ قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک نئے علم کلام کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی۔



سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اگرچہ کبھی صراحتہً کیا کُنایۂ بھی یہ تسلیم نہیں کیا۔

اور اُن کے مخصوص مزاج اور اُن فائدہ طبع کے پیشِ نظر اُن سے

اس کی توقع بھی عبث ہے..... کہ انہوں نے اپنی تحریک کے ”اصول و مبادی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے اخذ کئے ہیں تاہم واقعہ یہی ہے کہ ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ جب مسلمانان ہند کی قومی و ملی سیاست کا ایک رخ متعین ہو گیا اور اس کی قیادت و سیادت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا تو انہوں نے کسی دوسری راہ پر سوچنا شروع کیا اور اس کے لئے انہیں سارا پکا پکا یا اور بالکل تیار مواد مولانا ابوالکلام آزاد سے مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کی جگہ خود سنبھالی، ان کی وضع کردہ اصطلاح حکومت الہیہ کو اپنا نصب العین بنایا (جس کی مزید تشریح خیری برادران کر چکے تھے) ان کی حزب اللہ کے نقشے پر اپنی جماعت اسلامی قائم کر دی اور اپنی تحریک اسلامی، کو انہی خطوط پر شروع کر دیا جو مولانا آزاد نے متعین کئے تھے لیکن جن پر وہ اپنی بعض کمزوریوں یا کچھ موانع کے باعث آگے نہ چل سکے تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی اگرچہ ایک بہت بڑے

۱۔ اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے پختہ واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے (۱) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاء پر دازی کی بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا، (ii) نہ ابوالکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصور حکومت الہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکر خیر کیا (iii) اور نہ ہی علامہ اقبالؒ کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ ”تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں“! پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعویٰ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و سازگار ہے۔..... حتیٰ کہ جب علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تب بھی مدیرِ ترجمان القرآن نے کوئی کلمہ خیر..... یا کلمہ تعزیت اپنے موقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا ”میں اس وقت حالتِ جماد میں ہوں اور میدانِ قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے۔“ چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چودھری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا۔

”کہ ہم نے انقلاب چرچ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!“

مستف اور مؤنف ہیں اور بسیار نویسی میں ان کے مد مقابل صرف دو غلام احمد ہی ہیں۔ تاہم دین و مذہب کے میدان میں ان کا اصل مقام ابوالکلام مرحوم ہی کی طرح داعی کا ہے نہ کہ مفکر کا..... بایں ہمہ چونکہ ان کا وسیع و عریض لٹریچر صغیر کے طول و عرض میں بھی پھیلا ہے اور مشرق وسطیٰ میں بھی لُحْظاً اُلمت اسلامیہ کی جدید مذہبی فکر کے اس جائزے میں ان کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ !

مودودی صاحب خود بھی اس امر کے مدعی ہیں اور ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ وہ ”بیچ کی راس“ کے آدمی ہیں یعنی انہوں نے علی گڑھ کی پیدا کردہ مستجد داندہ ذہنیت اور دیوبند کے قدامت پرستانہ مزاج کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے اور گویا قدیم و جدید کو ہم کر دیا ہے ان کا دعویٰ اس اعتبار سے وزنی ہے کہ ان کی دینی دعوت اور ان کا مذہبی فکر دونوں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلے ہیں اور نہ صرف ملت اسلامیہ ہندوپاک بلکہ مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک کی نوجوان نسل کا بھی ایک خاصہ قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر ہے..... ان کے خود بیچ کی راس کے آدمی ہونے کا یہی ثمرہ تھا کہ ابتداء بر صغیر کے تمام درمیانی مکاتب فکر کے علبرداران کی جانب کھینچ آئے چنانچہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا، ایک جانب مولانا فرہابی کے جانشین مولانا اصلاحی اپنے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس آ گئے۔ دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندوی کے دونوں اہم شاگرد یعنی مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان کے گرد جمع ہو گئے..... پھر یہ بھی ان کے علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کی شخصیت ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایک جانب حلقہ دیوبند سے ایک بے تاب روح، مولانا محمد منظور نعمانی کی صورت میں ان کی طرف کھینچ آئی اور دوسری

۱۔ یعنی ایک آنجنمانی غلام احمد قادیانی اور دوسرے ایس جہانی غلام احمد پرویز!

۲۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سکہ بند مذہبی حلقوں میں سے مولانا مودودی کی طرف صرف اس طبقہ اہل حدیث کے لوگ آئے جو ایک تو غیر مقلد ہونے کے باعث ویسے ہی ”آزاد“ ہوتے ہیں، دوسرے واقعہ ہے کہ اس طبقے میں خدمت و نصرتِ دین کا داعیہ ہمیشہ سے اتنا شدید رہا ہے کہ یہ ہر نئی دعوت پر اس امید میں والہانہ لپکتے ہیں کہ شاید اسی کے ذریعے اسلام کی غربت ختم ہو جائے اور وہ خدا کے یہاں اسلام کے اس دور غربت میں اس کے ہمدرد و مؤنس و غم خوار شمار ہو جائیں!

طرف سلسلہ سرسید سے بھی مولانا عبد الجبار غازی (پرنسپل اینگلو عربک ہائی سکول دہلی) ایسے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا مودودی اس شیرازے کو مجتمع نہ رکھ سکے اور کوئی جلد اور کوئی بدیر بدظن یا غیر مطمئن ہو کر ان سے کٹ گیا۔ تاہم چونکہ ان میں تنظیمی صلاحیت اور محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے کا مادہ ابتدا ہی سے موجود تھا، وہ اس ساری آمدورفت کے علی الرغم ایک مذہبی فرقے کی حد تک لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مدرسوں اور دارالعلوموں دونوں سے ہی فارغ التحصیل شامل ہیں۔

مولانا مودودی کی تحریک اسلامی کہاں اور کس موقف سے شروع ہوئی اور پھر وہ کن کن مراحل سے گزر کر بالآخر کہاں پہنچی اور اب ”عشق بلاخیز“ کا یہ ”قافلہ سخت جان“ کس وادی اور کس منزل میں ہے یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب ”تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیق مطالعہ“ میں مفصل بحث کی ہے یہاں اصل گفتگو ان کی تحریک سے نہیں بلکہ ان کے ’مسک‘ سے ہے۔ اگرچہ یہاں اس اعتراف کا اعادہ کئے بغیر گزرا نہیں جہاں کہ راقم الحروف نے خود بھی شعور کی آنکھ اسی تحریک کی گود میں کھولی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ اسی کے طفیل پایا۔

فکر..... کے میدان میں مولانا مودودی نے ابتداء ہی سے یہ حکمت عملی برتی کہ فلسفہ اور علم کلام کے مشکل موضوعات سے کامل اجتناب کیا۔ حتیٰ کہ عقائد کے باب میں بھی ہمیشہ نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ بات کی۔ اور جتنی کی اس میں بھی زیادہ تر ان اعتقادات کو بیان (NARRATE) کرنے پر اکتفا کیا جو امت کے سواد اعظم کے یہاں معروف و مقبول ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو الٰہیات و ما بعد الطبیعیات سے بحث کی نہ جدید فلسفیانہ رجحانات سے تعرض کیا حتیٰ کہ ان گمراہ کن نظریات سے بھی براہ راست بحث و گفتگو سے احتراز کیا جو جدید سائنس کے مختلف شعبوں سے ابھرے ہیں۔ گویا کہ علم کلام کی اصل سنگلاخ وادی میں انہوں سرے سے قدم ہی نہیں رکھا

۱۔ ان نظریات مثلاً (ڈارون کا نظریہ ارتقاء) پر مولانا کی تنقید زیادہ سے زیادہ کچھ

مستہیل کہنے تک محدود ہے اور وہ بھی صرف رسائل و مسائل ”ایسی کتابوں میں۔

اس کے برعکس انہوں نے عمرانیاتِ اسلام کو اپنا اصل موضوع بنایا۔ اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی تمدن و اخلاق معاشرت و معیشت اور ریاست و سیاست کے باب میں جدید نظریات جن اصطلاحات میں اور جس اسلوب و انداز سے مرتب و تدون ہوئے ہیں انہی کو استعمال کر کے انہوں نے ’اسلامی نظامِ زندگی‘ کا ایک مربوط و منضبط تصور پیش کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ بلاشبہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس اعتبار سے انہیں زیادہ سے زیادہ ایک عمرانی مفکر (SOCIAL THINKER) قرار دیا جاسکتا ہے گویا کہ ان کی اولین نمایاں ترین اور بنیادی و اساسی حیثیت تو داعی کی ہے (اور اس پہلو سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا معنوی تسلسل ہیں) ثانوی حیثیت میں انہیں اسلام کا ایک جدید عمرانی مفکر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا حکمتِ عملی سے مودودی صاحب کو فائدے بھی بہت سے پہنچے مثلاً ایک ایسی ہی کہ اعتقادی و کلامی بحثوں سے احتراز کی بناء پر ایک طویل عرصے تک وہ مذہبی طبقات کی مخالفت سے بچ رہے۔ اور اس میدان میں قدم رکھتے ہی تکفیر و تنقیق کے جن فتوؤں کا سامنا ناگزیر ہوتا ہے ان سے محفوظ رہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا یہ اوسط درجے کا فکر قوم کے درمیانی و متوسط طبقے میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ بہت سے نوجوان ”اسلامی نظامِ حیات“ کے اس تصور کو قبول کر کے اس کے ’تقیاب‘ کی عملی جدوجہد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ گویا ان کی تحریک اسلامی کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ لیکن اس کے بہت سے مضر عواقب بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کا اعتقادی و تعبیری پہلو بالکل دب کر رہ گیا اور اسلام کی بس یہی ایک حیثیت نگاہوں کے سامنے رہ گئی کہ وہ ایک نظامِ زندگی ہے۔ پھر چونکہ عمرانیات کے مختلف شعبوں میں سے بھی مودودی صاحب کا اصل میدان ”سیاسیات“ کا ہے اور اسلام کے نظامِ زندگی میں بھی ان کی اصل نگاہ اس کے نظریہ ریاست و سیاست پر ہے لہذا پورے دین و مذہب

لہ اس موضوع پر اختصار کے ساتھ راقم نے اپنی تحریر ”اسلام کی نشاۃ ثانیہ“ میں بحث کی ہے اور تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک سابق رکن (بلکہ رکن شوری) وحید الدین صاحب نے ”تعبیر کی غلطی“ نامی کتاب میں بحث کی ہے۔